مسجد میں بلند آواز سے ذکر و اذکار کی شرعی حیثیت

تحریر: محمد عاطف

مسجد میں بلند آواز سے درود و سلام پڑھنا، ذکر و اذکار کرنا جبکہ دوسرے لوگ نماز، تلاوت اور مناجات میں مشغول ہوں ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر گفتگو کرتے ہوئے محض اسکے ایک جزوی حکم کو سامنے رکھنا کافی نہیں بلکہ اس کے متعلقہ تمام پہلوؤں کو سامنے رکھنا ضروری ہے، بالخصوص یہ دیکھنا ضروری ہے کہ آیا شریعت میں جہراً ذکر کا کیا حکم ہے، رسول خدا ﷺ کا معمول کیا تھا، صحابہ کرام مسجد میں جہراً ذکر کرتے تھے تو کس حال میں؟ صحابہ کے بعد تابعین اور تبع تابعین کا جہراً ذکر کرنے کے بارے میں کیا رائے تھی۔ لہٰذا ہم ان تمام پہلوؤں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے جہراً ذکر کی شرعی حیثیت پر بحث کریں گے۔

ہماری انتہائی بد قسمتی ہے کہ جہاں دین سے دور ہوئے نہیں کہ پورا کاروباری طبقہ دینی مسندوں پر بھی قابض ہو گیا اور کسی کے ہاتھ میں دال آئی تو پرچون کی دکان کھول بیٹھا اور کسی کے ہاتھ میں ہلدی آئی تو پنسار کی دکان کھل بیٹھا اور پھر پورے دین کے پرخچے اڑا کر رکھ دیے۔ پھر اس پر بھی نہ رکے کہ مروجہ فرقوں نے آکر پیٹھ میں ایسا چھرا گھونپا کہ جس کی مثال ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی۔ لیکن خدا نے اپنے اس دین کو تا قیامت زندہ رکھنا ہے لہٰذا وہ ایسے ایسے خوش نصیب لوگوں کو بھی نعمتِ علم عطا کرتا ہے جو بھیڑیوں کے جھنڈ میں جا کر بھی اس کا کلمہ بلند کرتے ہیں۔ خدا کا کروڑہا شکر ہے کہ اس نے اپنے اس ناچیز بندہ کو کلمۂ حق کہنے کی توفیق دی۔

یہاں ایک بات ابتدا ہی میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس مضمون کا مقصد کسی خاص فرد یا جماعت یا مخصوص طریقۂ فکر کو ہدف بنانا نہیں بلکہ کتاب و سنت کی روشنی میں مذکورہ مسئلہ کی حیثیت کو سمجھنا ہے جو معاشرے میں رائج ہے۔ جو عمل کتاب و سنت سے ثابت ہے وہ قابلِ عمل ہے خواہ ہمارے آباؤ اجداد بھی زد میں آتے ہوں، اور جو نہیں ثابت وہ قابلِ عمل تو درکنار قابلِ ذکر بھی نہیں ہے۔

اس پورے مضمون کی 3 دفعات ہیں:

1. عقل و شعور کے تقاضے اور تقلید
2. محبتِ رسول ﷺ کے تقاضے
3. مسئلہ کی نقلی اور عقلی حیثیت

دفعہ نمبر 1: عقل و شعور کے تقاضے اور تقلید

اس ضمن میں سب سے پہلی بات یہ کہ انسان کو جو عقل و فکر کے ذرائع یعنی آنکھ، کان، دل و دماغ دیے ہیں اگر ان کو معطل کر کے وہ اپنی گردن میں تقلید و جمود کا قلاوہ ڈال لے تو اس میں اور جانور میں فقط جنس کے سوا کوئی فرق نہیں رہتا۔ ایک حکیم کی حکمت سے یہ بات فروتر ہے کہ وہ با مقصد کائنات میں ایک انسان ہی بے مقصد پیدا کر دے یا انسان کو تمام اختیارات عطا کر کے اسکی رہنمائی کے لئے کوئی انتظام نہ کرے یا مرنے کے بعد نیک اور فاجر انسانوں کو تمام برابر جزا دے یا سرے سے کوئی حساب ہی نہ لے۔

لہٰذا اسکی حکمت کا جزوے لازم ہے کہ تمام اختیارات عطا کرنے کے ساتھ انسان کو غور و فکر اور تدبرِ آفاق و النفس کے لئے ایسے ذرائع بھی دیے جائیں جس سے کام لے کر وہ خود کو اس قابل بنا سکے کہ حق و باطل میں فرق کر سکے۔ تقویٰ و فجور، نیکی و بدی، کھرے اور کھوٹے، اقبال اور ادبار میں تمیز کر سکے۔ کم از کم اپنے وجود اور اس سے منسلک ذمہ داریوں کو جانچ سکے۔ لیکن اگر وہ ان ذرائع سے صراطِ مستقیم تک نہیں پہنچ سکتا، لکیر و فقیر، تنگ نظر یا عقل کو نقل پر ترجیح نہیں دیتا تو یہی اشرف المخلوقات اسفل السافلین کے درجہ تک جا گرتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں قرآن میں کثرت کے ساتھ ذکر آیا ہے۔

> أَمْ تَحْسَبُ أَنَّ أَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُونَ أَوْ يَعْقِلُونَ ۚ إِنْ هُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلًا
>
> "کیا تم سمجھتے ہو کہ ان میں سے اکثر لوگ سنتے اور سمجھتے ہیں؟ یہ تو جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔"
>
> (الفرقان: 44)

مزید سورۃ الاعراف میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

> ”یقیناً بہت سے جن اور انسان ایسے ہیں جن کو ہم نے جہنم کے لئے پیدا کیا ہے۔ ان کے پاس دل ہیں مگر وہ ان سے سوچتے نہیں، آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں، کان ہیں مگر سنتے نہیں۔ وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھوئے ہوئے ہیں۔“
>
> (الاعراف: 179)

یعنی جانور تو اس لئے جانور ہوا کہ اس کے پاس غور و فکر اور عقل و شعور کے لئے قوت اور استعداد نہیں ہے۔ اللہ نے اس میں سوچنے سمجھنے کا مادہ ہی نہیں رکھا۔ چرواہا جدھر ہانکے گا بغیر کسی توقف کے ادھر چل پڑے گا۔ اسے نہیں معلوم کہ اصل راستہ کدھر ہے اور ہم اسکے اشارے پر کدھر جا رہے ہیں۔ چراگاہ کی طرف رخ ہے یا قصائی کے پھٹے کی جانب۔ بہر حال اسکا قلادہ ہی فی الحال بتائے گا کہ آخری منزل کیا ہو گی۔ قصائی کا پھٹا ہوا تو اسی قلادہ کو پکڑ کا دبوچ دیا جائے گا یا پھر اسی قلادہ سے خم ٹھونک کر باندھ دیا جائے گا۔

اسی طرح عوام الناس بھی اپنے شیطان نفس اور گمراہ کن لیڈروں کے اشاروں پر آنکھیں بند کیے چلے جا رہے ہیں لیکن کچھ نہیں معلوم کہ فلاح کی طرف جا رہے ہیں یا کہ گمراہی کی طرف۔ اس حد تک تو ان کی حالت بھیڑ بکریوں کے مشابہ ہے، لیکن بھیڑ بکریوں کو خدا نے عقل و شعور سے نہیں نوازا، اگر قصائی اور چرواہے میں فرق نہ کرے تو معذور ہے۔ البتہ حیف ہے ان انسانوں پر جو عقل و شعور کی نعمت پا کر بھی اسفل السافلین کے درجہ کو پہنچ جاتے ہیں۔

اندھی تقلید – گمراہی کی ایک بڑی وجہ

قرآن الکریم میں گمراہی کی جو چند بڑی وجوہات بیان کی گئی ہیں ان میں سے ایک ”اندھی تقلید“ ہے۔ جو حضرات قرآن الکریم کو چشمِ بصارت سے پڑھتے ہیں ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ انبیاء نے جب اپنی قوم کو دعوتِ الی اللہ دی تو اس قوم کے اشرار اور بدترین رزائلِ اخلاق کے لوگ خم ٹھونک کر کہتے تھے کہ اجی یہ تو بڑی نرالی بات ہے جو ہم نے آج سے پہلے تو کبھی اپنے آباؤ اجداد سے نہیں سنی۔ اگر ہم نے تمہاری بات مان لی تو یہ بنا بنایا پندار اجڑ جائے گا۔ معاشرے میں ہماری کیا عزت رہے گی اور لوگ کیا کہیں گے کہ اپنے باپ دادا کے طریقہ کو چھوڑ دیا؟ خیر ہمیں نہ تمہاری، نہ تمہاری خیر خواہی کی ضرورت ہے۔

"جب کبھی ان سے کہا جاتا ہے کہ جو حکم خدا نے نازل کیا ہے اس کی پیروی کرو تو انہوں نے یہی کہا کہ ہم تو اس بات کی پیروی کریں گے جو ہمیں باپ دادا سے ملی ہے۔ اگر ان کے باپ دادا کسی بات کو نہ سمجھتے ہوں اور نہ راہِ راست پر ہوں تو کیا یہ پھر بھی انہیں کی پیروی کیے چلے جائیں گے۔"

(البقرہ: 170)

غرض نبی یا ان کے پیروکار جب بھی دعوت لے کر اٹھے تو لوگوں نے یہی حجت پیش کی کہ تم جو کہتے ہو یہ ہمارے باپ دادا کے طریقہ کے خلاف ہے اس لئے نہیں مانتے۔ جو شخص اس مرض میں بتلا ہے اس سے یہ کہنے کا آخر کیا حق ہے کہ وہ خدا کا بندہ ہے۔ اس کا خدا تو اس کے آباؤ اجداد، رسم و رواج اور طور طریقے ہیں جس پر حرف آنے سے اسکی جان نکلتی ہے۔ اسکو یہ جھوٹا دعویٰ کرنے کا آخر کیا حق ہے کہ وہ مسلمان ہے۔ مسلمان تو وہ ہے جو خدا اور اس کے رسول کے آگے سر خم کردے اور دل و دماغ سے پوری طرح اطاعت و اتباع کرے۔

تقلید کے ابطال پر قرآنِ کریم میں اس قدر آیات ہیں کہ مضمون تو درکنار ایک ضخیم کتاب بھی اس کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ مثال کے طور پر:

الصافات 26، 27، 32، 36، 62، 98، 109؛ البقرہ 165، 167، 170؛ الانبیاء 53؛ یونس 78؛ الزخرف 23، 25؛ لقمان 21، 23؛ الأعراف 28، 38، 39، 70، 71؛ ابراہیم 10؛ العنکبوت 25؛ ھود؛ حم السجدہ 5، 29؛ الاحزاب 67، 68؛ المومن 47، 49؛ المؤمنون 24، 83؛ الشعراء 74، 75؛ لقمان 21۔

مولانا رومیؒ رقم طراز ہیں:

زانکہ تقلید آفتِ ہر نیکوئی ست

کہ بود تقلید گر کوہِ قوی ست

تمام نیکیوں کو برباد کرنے کے لئے تقلید آفت ہے کہ تقلید گھاس کے برابر ہے گرچہ قوی پہاڑ ہو۔

حاصلِ کلام یہ کہ اللہ نے انسان کو سماعت، عقل اور بصارت اس لئے عطا کیے ہیں کہ وہ ان سے کام لے کر حق اور سچائی کا انتخاب کرے۔ نفس پرستی، خاندان اور قوم کے رسم و رواج کو اپنے گلے کا طوق نہ بنائے۔ عقل بھی اس بات کا حق رکھتی ہے کہ اشرف

المخلوقات ہونے کے ناطے سے اس کو اشرف المقاصد کے لئے استعمال کیا جاوے، نہ کہ غرور و تکبر اور شخصیت پرستی کی ھوس میں اس کو ضائع کیا جائے، اور اسی معیار کے مطابق استعمال کیا جائے جو اسکے خالق نے عطا کیا۔

اللہ نے جب انسانی ڈھانچہ تیار کر لیا، نوک پلک درست کی تو پھر اس میں روح پھونک دی اور تمام جنوں اور فرشتوں کو حکم ہوا کہ مسجودِ بشر ہو جاؤ تو تمام ملائکہ سجدے میں گر گئے سوائے ابلیس کے۔ اس نے تکبر کیا اور اڑ گیا کہ میں اپنے سے کم تر کو سجدہ نہیں کروں گا۔ اس کا تکبر لا علمی کی وجہ سے تھا۔ وہ اپنے عقائد کا غلام تھا اور بجائے اس کے کہ حق کو مان کر سجدہ ریز ہوتا، اس نے کھلے الفاظ میں انکار کر دیا۔

> قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ – "میں اس سے بہتر ہوں۔" (الأعراف: 12)
>
> "جسے تو نے سڑے ہوئے گارے کی کھنکناتی مٹی سے بنایا۔ میں ایک بشر کو سجدہ کرنے والا نہیں ہوں۔" (الحجر: 32، 33)

ابلیس کو بھی اس کا غرور اور تکبر لے ڈوبا اور اس بات کی طرف اس نے توجہ ہی نہ کی کہ حکم سرکار کی طرف سے ہے جس پر کوئی اعتراض کی گنجائش نہیں۔ پتہ نہیں کس نے عجیب اچھکولا چھوڑ دیا کہ ابلیس وقت کا عالم تھا۔ لا حول ولا قوۃ۔ ویسے آج کے علمائے سو کو دیکھ کر کبھی لگتا بھی ہے کہ جس ڈھٹائی کے ساتھ یہ حق کو چھپاتے اور منہ موڑتے ہیں۔

> ترجمہ: "یقیناً وہ لوگ جو چھپاتے ہیں اس شے کو جو ہم نے نازل کی بیّنات میں سے اور ہدایت میں سے، بعد اس کے کہ ہم نے اس کو واضح کر دیا ہے لوگوں کے لیے کتاب میں، تو وہی لوگ ہیں کہ جن پر لعنت کرتا ہے اللہ اور لعنت کرتے ہیں تمام لعنت کرنے والے۔"
>
> (سورۃ البقرہ: 159)

اگرچہ کہ آیت میں ان یہود علما کی مذمت کی گئی ہے جو جان بوجھ کر حق بات کو چھپاتے تھے، مگر آیت کے الفاظ عام ہیں۔ قانون اور دستور میں جو چیز اصول کے طور پر پیش کی جائے اسکا اطلاق ہر اس معاملے پر یکساں لاگو ہوتا ہے جو اس اصول کے دائرۂ کار میں آئے۔ لہٰذا اس میں وہ تمام علمائے سو بھی شامل ہیں جو اپنے مروجہ باطل فرقوں کے علم کو بلند رکھنے کی خاطر قرآن و سنت کو بھی پسِ پشت ڈالتے ہیں، اپنے امام وپیشواؤں کی اندھی تقلید میں ایسے گرفتار ہوتے ہیں کہ انکے سامنے قرآنی آیات اور سنتِ نبوی سے ان کے باطل نظریات کو ثابت بھی کر دیا جاوے تب بھی ان کو فرق نہیں پڑتا۔ ہوس کے مارے اور معاشرتی اثر و رسوخ کے ایسے

گرویدہ ہوتے ہیں کہ حق بات قبول کرنے میں انکی جان نکلتی ہے، اور جیسے کہ اردو میں کہاوت ہے: "اندھوں میں کانا راجا"۔ اپنے متبعین اور مریدوں کی نظر میں بھی ان کا کچھ ایسا ہی مقام ہے۔

اہلِ علم کے اقوال – تقلید کی حقیقت

مشہور عالمِ دین علامہ ابن جوزیؒ (597ھ) نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا عنوان "اخبار الحمقیٰ المغفلین" ہے، جس کا اردو مطلب "بیوقوفوں کا جہاں" ہے، جس میں وہ انسان کی اسی حماقت کا ذکر کرتے ہیں کہ یہ اپنی جہالت کی بناء پر غلطی کرتا ہے اور پھر اصرار کیے چلے جاتا ہے۔ قبر میں جو سوال ہوتا ہے کہ "تو اس آدمی کے متعلق یعنی محمد ﷺ کے بارے میں کیا کہتا تھا؟" تو کافر اور منافق جواب دیتا ہے:

> [اصل تحریر میں اس مقام پر عربی متن درج نہیں تھا]

پھر اسے کہا جاتا ہے:

> [اصل تحریر میں اس مقام پر عربی متن درج نہیں تھا]

یہ حدیث صحیح ابن حبان، مسند احمد، نسائی، صحیح بخاری، مسلم، ابو داؤد اور السنن الکبریٰ البیہقی میں موجود ہے۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے علامہ ابن جوزیؒ (597ھ) لکھتے ہیں:

> "فِیہ دَلیل علی تَحرِیم التَقلیدِ فِی اصول الدین"
>
> یہ حدیث اصولِ دین میں تقلید کے حرام ہونے پر قطعی دلالت کرتی ہے۔ عاقل کو چاہیے کہ وہ جو عقیدہ رکھتا ہے یقین کے ساتھ اسکی معرفت رکھے۔ اس میں کسی کی تقلید نہ کرے کیونکہ مقلد تو اندھا ہوتا ہے جو اپنے پیشوا کے پیچھے چلتا ہے۔
>
> (کتاب المشکل من الحدیث الصحیح)

حافظ ابن القیمؒ لکھتے ہیں:

> "وَالتَقلید لَیس بالعلم باتفاق اَھل العِلم" – اہلِ علم کا اتفاق ہے کہ تقلید علم نہیں ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ لکھتے ہیں:

"اگر تم یہودیوں کا نمونہ دیکھنا چاہتے ہو تو علمائے سو کو دیکھو جو دنیا کی طلب اور اپنے سلف کی تقلید پر جمے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ کتاب و سنت کی نصوص سے منہ پھیرتے ہیں اور اپنے پسندیدہ عالم کے تعمق، تشدد اور استحسان کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں۔ انہوں نے رسولِ کریم ﷺ جو کہ معصوم ہیں، کے کلام کو چھوڑ کر موضوع اور فاسق تاویلوں کو گلے سے لگا لیا ہے، اس وجہ سے یہ لوگ ہلاک ہو گئے ہیں۔"

(الفوز الکبیر فی اصول التفسیر)

امام شافعیؒ کا قول ہے:

"میری ہر بات جو نبی ﷺ کی صحیح حدیث کے خلاف ہو، چھوڑ دو۔ آپ ﷺ کی حدیث ہی سب سے بہتر ہے اور میری تقلید نہ کرو۔"

(آدابُ الشافعی و مناقبہ، ابن ابی حاتم)

امام احمد بن حنبلؒ لکھتے ہیں:

"اپنے دین میں ان میں سے کسی کی تقلید نہ کرو۔"

(مسائل ابی داوٗد)

امام مالکؒ لکھتے ہیں:

"بے شک میں ایک انسان ہوں، میری بات غلط بھی ہو سکتی ہے اور صحیح بھی۔ پس تم میری رائے میں غور کرو، کتاب و سنت کے مطابق ہو تو لے لو ورنہ چھوڑ دو۔"

(الاحکام لابن أبي حزم 6/149، الجامع لابن عبد البر 2/12)

امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے:

"جب میں کوئی ایسی بات کہوں جو اللہ کی کتاب اور احادیثِ رسول کے خلاف ہو تو اسے چھوڑو۔"

(ھمم اولی الابصار، ص 50)

ایک دن قاضی ابو یوسفؒ سے کہا:

> ”اے یعقوب (ابو یوسف) تیری خرابی ہو، میری ہر بات نہ لکھا کرو، میری آج ایک رائے ہوتی ہے اور کل بدل جاتی ہے۔ کل دوسری رائے ہوتی ہے تو پرسوں وہ بھی بدل جاتی ہے۔“

امام ابو جعفر الطحاویؒ سے مروی ہے:

> ”تقلید تو صرف وہی کرتا ہے جو بے وقوف اور متعصب ہوتا ہے۔“

علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں:

> ”یہ کہنا واجب ہے کہ ہر وہ شخص جو رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی دوسرے امام سے منسوب ہو جائے اور اس انتساب پر وہ دوستی رکھے تو یہ شخص بدعتی ہے۔ اہلِ سنت و الجماعت سے خارج ہے خواہ اصول میں ہو یا فروع میں۔“
>
> (الکنز المدفون والفلک المسحون، ص 149)

عبید اللہ الدلوسی حنفیؒ فرماتے ہیں:

> ”تقلید کا ماحاصل یہ ہے کہ مقلد اپنے آپ کو جانوروں، چوپایوں کے ساتھ ملا دیتا ہے۔ اگر مقلد نے اپنے آپ کو جانور سے نیچے بنا لیا ہے تو وہ عقل و شعور سے پیدل ہے، تو اسکا دماغی علاج کرنا چاہیے۔“
>
> (تقویم الادلہ فی اصول الفقہ)

ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں:

> ”اس امت کے کسی فرد پر حنفی، شافعی، مالکی یا حنبلی بننا واجب نہیں۔“
>
> (معیارِ حق، ص 75)

امام طحاویؒ لکھتے ہیں:

> ”ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں ابو حنیفہ کے تمام اقوال کو قبول کر لوں، کیونکہ تقلید تو متعصب اور بیوقوف کا کام ہے۔“
>
> (اصولِ سرخسی از علامہ سرخسی 1/28)

اور امام طحاویؒ وہ ہیں جنھوں نے شافعی مذہب سے حنفی مذہب اختیار کیا تھا۔

خلاصۂ کلام

یہاں تک کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو عقل دی اور عقل کا تقاضا غور و فکر ہے۔ غور و فکر انسان کو حق اور باطل میں فرق کرنے کی صلاحیت دیتی ہے، مگر عقل خود دین کا آخری معیار نہیں۔ اللہ نے رسول بھیجے، رسول اللہ ﷺ نے کتاب اللہ کو حرف بہ حرف لوگوں تک پہنچایا بلکہ سب سے بڑھ کر خود عملاً اپنی زندگی میں کر کے دکھایا۔ اسی عملی نمونے کا نام سنت ہے۔ لہٰذا رسول سے محبت کا حقیقی تقاضا صرف جذبات نہیں بلکہ اتباع ہے۔

مضمون کی طوالت سے بچنے کے لئے میں نے قرآنِ کریم کی کئی آیات کو حذف کیا ہے، ورنہ میرا دعویٰ ہے کہ قرآنِ کریم میں تقلید کی حلت پر ایک آیت بھی موجود نہیں ہے اور یہ لفظ جہاں بھی آیا ہے جانوروں کے لئے بولا گیا ہے۔

دفعہ نمبر 2: محبتِ رسول ﷺ کے تقاضے

خدا کے قانون میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ لوگوں کی رہنمائی کے لئے اللہ نے ایک ضخیم کتاب چھاپ کر تمام لوگوں کو دے دی ہو، یا انسان کی مرضی اور خواہش کے مطابق ہر دور میں نئے قوانین مرتب کر کے لوگوں کے حوالے کر دیے ہوں، بلکہ اس نے انسانوں میں سے ہی سب سے بہترین شخص کا انتخاب کیا جو اس منصبِ نبوت کے لئے موزوں تھا، جو اپنی بلند پایہ شخصیت اور سیرت و اخلاق میں نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔ پھر اس کی باقاعدہ رہنمائی فرمائی اور جب کسی قوم میں دعوت کا وقت آپہنچا تو اللہ نے غیر معمولی طریقے سے اس پر وحی فرما کر باقاعدہ منصبِ نبوت پر فائز کیا۔

جو سرکاری احکامات وصول ہوتے، جوں کے توں لوگوں تک پہنچا دیتا۔ خدا کی طرف سے وہ واحد سرکاری نمائندہ ہوتا ہے جس پر ہر حکم من جانب اللہ ہوتا ہے۔ ہر طریقہ عین خدا کی رہنمائی میں ہوتا ہے۔ جس کی کوئی ذاتی جائیداد نہیں کہ اسکے بعد وارثوں میں تقسیم ہو سکے، بلکہ یہ وراثت وہ علم ہوتا ہے جو اسے وحیِ الٰہی سے ملتا ہے اور اسکی زندگی کا ایک ایک پہلو عملاً اس تعلیم کا ثبوت ہوتی ہے۔ اور پھر تا وقت خدا کسی اور پیغمبر کو نئی شریعت دے کر نہیں بھیجتا، اس وقت تک اسکی تعلیم (شریعت) واجب الاطاعت ہوتی ہے۔

چونکہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت پر نبوت کا دروازہ تا قیامت بند ہو چکا ہے اور اب کوئی نبی نہیں آئے گا، لہذا تا قیامت جو شریعت واجب الاطاعہ اور جو سنت واجب الاتباع ہے وہ ہمارے نبی ﷺ سے ہی ملے گی۔ اب اگر کوئی شخص یا گروہ یا قوم سرکاری نمائندہ یعنی پیغمبر کی بجائے اگر کسی اور ذریعہ ہدایت کی غرض سے کسی اور کی طرف رجوع کرتا ہے اور دینی معاملات میں ترجیح دیتا ہے تو بلا شبہ وہ ذیل میں چند باتوں کا مرتکب ہو گا:

4. خدا کا پیغمبر ہی اس کے نزدیک معیارِ حق نہیں، بلکہ وہ فلاں امام بھی ہے۔
5. دوسری، اسکا فلاں امام تنقید سے بالا تر ہے، حالانکہ تنقید سے بالا تر صرف اللہ کی کتاب اور نبی کی سنت ہے۔
6. فلاں امام کے پاس کوئی خدائی سند ہے جسکی بناء پر اسے رہنمائی کے لئے پیشوا مانے بیٹھے ہیں۔
7. اسکا طریقہ نبی کے طریقہ سے سہل ہے۔ اعاذ اللہ من ذالک
8. وہ اپنی پشت پر ایسا جتھا رکھتا ہے کہ روزِ قیامت خدا سے اپنے مریدوں اور پیشواؤں کو چھڑوا لے گا۔

ان ساری باتوں کو ماننے کے لئے دو صورتیں ہی ممکن ہیں کہ:

9. خدا نے اپنی کتاب میں کہا ہو کہ معیارِ حق صرف پیغمبر نہیں بلکہ تمہارے اپنے بنائے امام بھی ہیں۔
10. یا اس کتاب سے باہر کوئی اور خدائی سند ہے جو کسی پہاڑ کی چوٹی، سمندر کی تہہ یا کسی غار میں پڑی ہاتھ لگ گئی ہے۔

اگر پہلی صورت ہے تو براہِ کرم کتاب اللہ سے وہ آیت کا حوالہ دے دیجیے جس میں اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول کے ساتھ مطلقاً اطیعوا امائکم کے الفاظ آئے ہوں یا ہلکا اشارہ موجود ہو۔ اگر دوسری صورت ہے تو براہِ کرم وہ سند پیش کیجئے؟

لہذا رسولِ خدا ﷺ کی اطاعت اور اتباع ہی واحد مشعلِ راہ ہے، اور محبت کا حقیقی تقاضا یہ ہے کہ ہم شخصی محبت کا قلادہ اتار دیں اور کسی کو یہ حیثیت نہ دیں کہ خدا کی کتاب اور اس کے نبی کے حکم کے بعد بھی اسکی ضرورت رہے۔ جیسے سراب پر عمارت اور پانی پر نقش نہیں بن سکتا، ویسے ہی خدا اور اس کے رسول کی کلی اطاعت سے ہٹ کر کسی دوسرے کی اطاعت دنیا و آخرت میں نفع بخش ہرگز نہیں ہو سکتی ہے۔ ایسا احمق کون ہو سکتا ہے کہ جو منہ کے اڑائے چھینٹوں اور بارش میں امتیاز نہ کر سکے۔

> "اے پیغمبر کہہ دیجئے ! اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو۔"
>
> (آل عمران: 31)

سورۃ النساء میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

> ”آپ کے رب کی قسم ! یہ لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک اپنے باہمی اختلافات میں آپ کا حکم نہ مان لیں، پھر جو فیصلہ آپ کریں اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور اسے پوری طرح تسلیم کریں۔“

حدیثِ مبارکہ ہے:

> ”میں تم میں دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں، اگر اسے مضبوطی سے تھامے رکھو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ ایک اللہ کی کتاب اور دوسری اسکے رسول کی سنت۔“
>
> (موطا امام مالک 1594، حاکم 319، البزار 8993، البیہقی (7) 20336، دار قطنی 4606)

لیکن افسوس کہ لال بجھکڑوں نے قرآن اور سنت کو پسِ پشت ڈال کر شخصیت پرستی کا ایسا طوق گلے میں ڈالا کہ دین میں نت نئی چیزوں کو ایجاد کر کے بدعات کا بازار گرم کر دیا ہے۔

محبتِ رسول ﷺ کے چند نمونے

اب میں چند احادیث و واقعات کی روشنی میں محبتِ رسول ﷺ کے چند نمونے بیان کروں گا۔

حضرت عمرؓ نے حجرِ اسود کو بوسہ دیا اور فرمایا:

> ”تو ایک پتھر ہی تو ہے جو نہ نفع پہنچا سکتا اور نہ نقصان۔ اگر میں نے آپ ﷺ کو نہ دیکھا ہوتا کہ تجھے بوسہ دیتے تھے تو میں تجھے کبھی نہ چومتا۔“
>
> (بخاری 1097، مسلم 127)

ابن عباسؓ نے ایک موقع پر فرمایا:

> ”قریب ہے کہ تم لوگوں پر آسمان سے پتھر برسیں کہ میں تمہیں نبی ﷺ کا حکم سناتا ہوں اور تم اس کے مقابلہ میں ابو بکر اور عمر کے اقوال پیش کرتے ہو۔“

اب کوئی بتائے کہ حضور اکرم ﷺ کے بعد مقام و مرتبہ ابو بکرؓ اور عمرؓ سے بلند کوئی ہے؟ جو لوگ حضور ﷺ کے حکم سننے کے بعد بھی اپنے عقائد پر جمے رہتے ہیں اور امام کے قول کو ترجیح دیتے ہیں، ان کے لئے یہ حدیث کافی ہے۔ اگر ابو بکر و عمرؓ کے اقوال حجت نہ بن سکے تو پھر قرآن و سنت کے ہوتے ہوئے حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی پیروؤں کے علما اور مروجہ باطل فرقوں کے امام کیسے حجت ہو سکتے ہیں۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے، تم کیسے حکم لگاتے ہو؟" (القلم: 36)

حضرت عمرؓ تورات کا ایک نسخہ لئے حضور اکرم ﷺ کے پاس آئے اور کہا کہ اللہ کے رسول! یہ تورات کا نسخہ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

> "قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اگر موسیٰ ؑ بھی ظاہر ہو جائیں اور تم ان کی اتباع کرنے لگو تو سیدھے راستے سے بھٹک جاؤ گے۔ اگر موسیٰ ؑ زندہ ہوتے اور میری نبوت کو پاتے تو انہیں بھی میری اتباع کرنی پڑتی۔"
>
> (رواہ الدارمی 435، احمد 15156، ابن ابی شیبہ 26949، ابی یعلی 2135، البیہقی فی شعب الایمان 2330، وحسن ابن الحجہ وصحہ ابن کثیر مع وجود کلام فی سند بعض طرقہ بسبب مجاہد بن سعید)

اب اگر حضور اکرم ﷺ کی موجودگی میں حضرت موسیٰ ؑ کی پیروی کرنے والا گمراہ ہو گا، تو نبی ﷺ کی احادیث و سنن کی موجودگی میں امام ابو حنیفہ، شافعی اور دیگر اماموں کی تقلید کو فرض واجب سمجھ کر سنت کے اتباع کی بجائے امام کے قول کو ترجیح دے، تو ایسے عاشقِ رسول کے اعمال غارت ہونے میں کیا شبہ باقی رہتا ہے۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ ہم رسول ﷺ کے پاس تھے۔ آپ نے ایک خط کھینچا، پھر اس خط کے دائیں بائیں دو دو خط کھینچے اور پھر بیچ والے خط پر ہاتھ رکھا اور فرمایا:

> "یہ اللہ کا راستہ ہے۔" پھر سورۃ الانعام کی ایک آیت تلاوت کی، یعنی اللہ فرماتا ہے کہ "یہ میری راہ ہے جو بالکل سیدھی ہے، تو تم اسی راہ پر چلو۔ دوسرے راستوں پر نہ چلو، وہ راہیں تمہیں اس راہ سے بھٹکا دیں گی۔"
>
> (ابن ماجہ 11، احمد 4142 و 15277، السنن الکبریٰ النسائی 11174، ابو داود الطیالسی 241، حاکم 3241)

آپ ﷺ کا یہ قولی معجزہ آج چار مسلکوں (حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی) کی شکلوں میں حرف بہ حرف ثابت ہوا۔

شام سے ایک شخص عبد اللہ ابن عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا، عرض کی کہ آپ حجِ تمتع کا حکم دیتے ہیں جبکہ آپ کے والد عمرؓ منع فرماتے تھے۔ ابن عمرؓ نے فرمایا: اگر رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ہو اور میرے باپ نے منع کیا ہو تو کس کا حکم مانو گے؟ شامی نے کہا کہ نبی ﷺ کا۔ تو ابن عمرؓ نے فرمایا: پھر آپ ﷺ تمتع فرماتے تھے۔

(ترمذی 824، احمد 5700، ابی یعلی 5454، الکبریٰ للبیہقی 8964، 8965، البزار 6042، المعجم الکبیر للطبرانی 14084)

آج کے بے مایہ مسلمانوں کو دیکھ کر انسان ورطہ حیرت میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ کہاں صحابہ کرامؓ کا عشقِ رسول کہ اگر امیر المومنین کا عمل بھی نبی ﷺ کے طریقہ سے بال برابر بھی ہٹا تو فوراً نبی ﷺ کی سنت کا اتباع کیا۔

مروان بن حکم نے کہا کہ میں اس وقت موجود تھا جب حضرت عثمانؓ حجِ تمتع اور حجِ قران سے منع کرتے تھے، تو حضرت علیؓ نے سن کر احرام باندھا، حجِ قران کیا اور فرمایا کہ میں کسی کے کہنے کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کی سنت کو نہیں چھوڑ سکتا۔

(بخاری)

جب اللہ کے نبی ﷺ کی سنت اور طریقے کے خلاف حضرت عثمانؓ کا قول آیا تو حضرت علیؓ نے بغیر کسی جھجک کے اسے رد کر دیا۔ تو آخر ان بوالفضولوں اور کم سواد فلسفیوں کی ذہنی بیماری کو کس طرح ٹھیک کیا جائے جو حدیثِ مبارکہ سننے کے بعد بھی اپنے مروجہ فرقوں کے امام کے اقوال کو سینے سے لگائے رکھتے ہیں۔ یہ مخمل اور زربفت کی جھول نہیں جو اکثر گدھوں پر بھی نظر رکھتی ہے، بلکہ یہ خلعتِ الٰہی، ھدایت اور اتباعِ سنت کی وہ نعمت ہے جو اللہ کے چنے ہوئے لوگوں کو ہی نصیب ہوتی ہے۔ کوئی آنکھ کا اندھا یا گانٹھ کا پورا ہی ہو گا جو اتباعِ سنت اور اندھی تقلید میں فرق نہ کرتا ہو۔

اس دفعہ کو میں ایک حدیثِ مبارکہ سے مکمل کروں گا جو اپنے اندر سمندر کو کوزے میں سمیٹنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

> ایک شخص حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ کے پاس بیٹھا تھا کہ اسے چھینک آئی تو اس نے کہا: "الحمد للہ و السلام علیٰ رسول اللہ"۔ عبد اللہ ابن عمرؓ نے فرمایا: میں بھی یہ الفاظ کہہ سکتا ہوں لیکن رسول اللہ ﷺ نے ایسا نہیں کہا۔ آپ ﷺ نے ہمیں سکھایا کہ ہم جواب میں کہیں: "الحمد للہ علیٰ کل حال"۔

بظاہر اس شخص نے کوئی غلط بات نہیں کی، نہ کسی حد کو توڑا اور نہ حکم عدولی کی، لیکن ابن عمرؓ نے صاف اور دو ٹوک الفاظ میں بتا دیا کہ جو چیزیں جتنی اور جس حد تک اللہ کے نبی ﷺ سے ثابت ہیں اس میں رد و بدل کے ہم مجاز نہیں۔ لہٰذا کوئی مقام و مرتبہ میں کتنا

ہی بڑا شخص ہو، اگر اس کا قول اور فعل نبی ﷺ کی سنت کے خلاف ہے تو بغیر کسی توقف کے ناقابلِ قبول ہے۔ حقیقت میں اسی چیز کا نام اتباعِ سنت ہے۔

دفعہ نمبر 3: مسئلہ کی نقلی اور عقلی حیثیت

کتبِ احادیث اور آئمہ اسلام کی تشریحات کی روشنی میں ہم نقلی اور عقلی دلائل سے اس بحث پر گفتگو کریں گے۔ لہٰذا اس کو مندرجہ ذیل دفعات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

11. ذکر و اذکار جو سنت سے ثابت ہیں
12. حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں صلوٰۃ و السلام
13. مسجد میں بلند آواز سے جہراً ذکر

پہلی دونوں دفعات مضمون کی بحث میں شامل نہیں، کیونکہ اذکار جو سنت سے ثابت ہیں وہ قابلِ عمل ہیں اور آپ ﷺ کی خدمت میں درود و سلام پیش کرنا ہر حال میں جائز ہے۔ لیکن اگر یہ دونوں تیسری دفعہ کے ساتھ ملائیں تو بات واضح ہوتی ہے کہ اصل چیز وہ ادب و احترام ہے، جسے ملحوظِ خاطر رکھ کر ذکر کیا جائے تو بلا شبہ اس سے بہتر کوئی چیز نہیں، اور یہی اگر حدود کا احترام کیے بغیر ادا کیے جائیں تو وہ مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے جس کے لئے شریعت نے اذکار وضع فرمائے ہیں۔

نقلی دلائل – احادیث کی روشنی میں

امام المحدثین ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل البخاریؒ نے اپنی صحیح بخاری میں ایک باب باندھا ہے جس کا عنوان "نماز کے بعد ذکرِ الٰہی کرنا" ہے۔ اس میں وہ حدیثِ مبارکہ بیان کرتے ہیں کہ:

> "عبد اللہ بن عباسؓ کے غلام ابو معبد نے انہیں خبر دی اور انہیں عبد اللہ بن عباسؓ نے، کہ بلند آواز سے ذکر کرنا فرض نماز سے فارغ ہو کر نبی ﷺ کے زمانۂ مبارک میں جاری تھا۔"
>
> (البخاری 841)

اس حدیث میں یہ واضح نہیں کہ وہ ذکر کیا ہے، لہٰذا اس کے لئے ہمیں اس حدیث کے ذریعے باقی طرق دیکھنے ہوں گے۔ لہٰذا اسی سے اگلی حدیث میں وہ ذکر بھی آجاتا ہے جس میں الفاظ ہیں، یعنی نبی ﷺ کی نماز ختم ہونے کو تکبیر سے سمجھا جاتا تھا۔

(صحیح مسلم 1316، 1317، 1318؛ ابو داؤد 1002، 1003؛ النسائی 1334؛ تحفۃ الاشراف 6512)

اس حدیثِ مبارکہ سے معلوم ہوا کہ نماز کا اختتام اللہ کے ذکر سے ہوتا ہے اور یہ ذکر تکبیر یعنی "اللہ اکبر" کی شکل میں ہوتا ہے۔ پورے ذخیرۂ احادیث سے ہمیں یہ معلوم نہیں ہوا کہ کبھی صحابہ کرامؓ، تابعین اور تبع تابعین نے با جماعت نماز کے بعد کبھی "اللہ اکبر" کے علاوہ بھی کوئی بلند آواز میں جہراً ذکر کیا ہو۔

ملا علی قاری حنفیؒ نے مرقاۃ المصابیح میں اس حدیث کی شرح یوں کی ہے:

> تکبیر سے مراد نبی ﷺ نماز سے فارغ ہو کر "اللہ اکبر" کہا کرتے تھے۔ البخاری و مسلم کی روایت کے مطابق آیت "ولا تجہر بصلاتک" دعا کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ جبکہ امام بیہقیؒ آہستہ آواز سے ذکر کرنے کے مطلوب ہونے پر صحیحین کی اس روایت سے بھی استدلال کرتے ہیں جس کے مطابق نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو بلند آواز سے تہلیل و تکبیر کی ممانعت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ "تم کسی بہرے یا غائب خدا کو نہیں پکار رہے، وہ تو تمہارے ساتھ ہے، سنتا ہے اور انتہائی قریب ہے۔"

اس کے علاوہ محدثین نے تکبیر کو محض "اللہ اکبر" تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ حضور اکرم ﷺ کے مسنون اذکار کو جو احادیث سے ثابت ہیں ان کو بھی شامل کیا ہے، جیسے 33 مرتبہ الحمد للہ، 33 مرتبہ سبحان اللہ اور 34 مرتبہ اللہ اکبر۔ کیونکہ یہ ذکر بھی جہراً ہرگز نہیں کیا جاتا، لہٰذا اس سے بلا شبہ بلند آواز سے "اللہ اکبر" کہنا ہی مراد ہے۔

لہٰذا ان تمام احادیث سے معلوم ہوا کہ نماز کے بعد ذکر کرنا تو سنت سے ثابت ہے، لیکن اس ذکر سے مراد وہ ذکر نہیں جو آج ہماری مسجدوں میں تکبیر کے بعد جہراً پڑھا جاتا ہے۔

آئمہ و فقہاء کے اقوال

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فقہ کی کتابوں سے آئمہ اسلام کے اقوال بھی پیش کر دیے جائیں، جس سے معلوم ہو سکے کہ آیا یہ عمل (مسجد میں جہراً ذکر کرنا) ان کے نزدیک کیا حیثیت رکھتا تھا۔

علامہ ابن الھمامؒ نے فتح القدیر میں امام ابو حنیفہؒ کا یہ قول نقل کیا ہے:

> "رفع الصوت بالذکر بدعۃ" – یعنی ذکر میں آواز بلند کرنا بدعت ہے۔
>
> پھر وہ قرآن کی آیت سے استدلال کرتے ہیں جس کا ترجمہ ہے: "اپنے رب کو اپنے دل میں عاجزی اور خوف کے ساتھ یاد کرو اور بات میں آواز بلند نہ کرو۔"

یہ عبارت فتح القدیر، کتاب الصلاۃ العیدین میں موجود ہے۔ یہی قول ابن نجیمؒ نے البحر الرائق میں ابن ہمامؒ سے نقل کیا ہے۔ پھر امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ جس موقع پر شریعت جہراً ذکر کرنے کی اجازت دیتی ہے وہاں جہر کیا جائے، اس کو ہر ذکر کے لئے عمومی معمول نہ بنایا جائے۔

ابن نجیمؒ کی الاشباہ و النظائر میں مسجد کے آداب کے تحت عبارت ہے:

> "ورفعُ الصوتِ بالذکرِ الا للمتفقہ" – یعنی مسجد میں ذکر کے لئے آواز بلند کرنا ممنوع ہے، البتہ علمی تعلیم / تفقہ کی ضرورت کے لئے (جائز ہے)۔

ابن عابدینؒ نے ردالمحتار میں اس مسئلہ کی تفصیل میں مختلف اقوال کو جمع کیا ہے، مثلاً اگر جہراً ذکر سے نمازی، سوئے ہوئے شخص یا قرآن پڑھنے والے کو تشویش ہو تو اس صورت میں ممانعت واضح ہے۔

عقلی دلائل

نقلی دلائل کے بعد اب ذرا عقلی اعتبار سے بھی اس مسئلے کی حیثیت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ نمازِ با جماعت میں امام کے علاوہ مقتدی کو بلند آواز سے قراءۃ کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ جواب نفی میں ہے۔ امام کے پیچھے مقتدی بھی اپنی نماز ہی ادا کر رہا ہے، وہ بھی قرآن پڑھتا ہے، رکوع و سجود کرتا ہے، مگر اسے بلند آواز سے قراءت کرنے کی اجازت نہیں، کیونکہ یہ عمل جہاں با جماعت نماز کی ہیئت کے خلاف ہے، وہیں اگر فرضِ محال وہ بلند آواز سے قراءت کرتا ہے تو اسکی آواز دوسرے نمازیوں کی نماز میں خلل کا باعث بن سکتی ہے۔

اب اگر کوئی شخص جماعت میں دیر سے شامل ہوا اور امام کے سلام پھیرنے کے بعد اپنی باقی نماز مکمل کرنے کے لئے کھڑا ہوا، تو کیا اس وقت اسے یہ حق مل جائے گا کہ وہ بلند آواز سے قراءت کرے، محض اس وجہ سے کہ اب امام خاموش ہو چکا ہے؟ یقیناً ایسا نہیں ہے، حالانکہ دونوں صورتوں میں اصل عمل قراءت ہی ہے، فرق صرف آواز کے بلند یا پست ہونے کا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ممانعت محض ذکر یا قراءت کرنے کی نہیں بلکہ ایسے جہر کی ہے جو دوسرے کی عبادت میں خلل کا سبب ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ خشوع و خضوع صرف نمازی کی اپنی کوشش کا نام نہیں بلکہ ماحول بھی اس پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہو، قرآن پڑھ رہا ہو، رکوع و سجود میں مشغول ہو اور اپنے دل کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کرے — اگر اس کے ارد گرد مسلسل شور و غل ہو، بلند آوازیں ہوں، مختلف اذکار اس کی توجہ منتشر کر رہے ہوں، تو کیا یہ کہنا درست ہو گا کہ ماحول کا اس کی نماز اور خشوع و خضوع پر کوئی اثر نہیں ہوتا؟ یقیناً نہیں۔

انسان کا ذہن آوازوں اور ارد گرد کے حالات سے متاثر ہوتا ہے، اور شریعت نے اسی انسانی فطرت کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے دوسروں کی عبادت میں خلل ڈالنے سے روکا ہے۔

تیسری بات ادب کی ہے۔ کیا ادب عبادت کے لوازم میں سے نہیں؟ اگر ہے تو کیا ادب صرف اس قدر ہے کہ ہم دو زانو بیٹھ جائیں، سر پر سفید ٹوپی پہن لیں، لباس سنت کے مطابق پہن لیں، اور پھر اپنے عمل سے دوسروں کی عبادت میں خلل ڈالتے رہیں؟ کیا مسجد کے ادب کا تقاضا صرف اپنی ہیئت اور ظاہری وضع قطع کا خیال رکھنا ہے، یا اس میں یہ بھی شامل ہے کہ دوسرے مسلمان کو عبادت کے دوران اذیت نہ دی جائے؟

بالخصوص جب ایک شخص اللہ کے سامنے کھڑا ہو اور اس کی بارگاہ میں مناجات کر رہا ہو، قرآن کی تلاوت کر رہا ہو اور اپنے رب کے سامنے خشوع و خضوع اختیار کرنے کی کوشش کر رہا ہو، تو دوسرے شخص کو یہ حق آخر کس نے دیا کہ وہ اپنی آواز کے ذریعے اس کی عبادت میں خلل ڈالے۔

لہٰذا یہ تصور بھی بے معنی ہے کہ ذکر کو بلند آواز سے کرنے کا مقصد یہ ہو کہ ہماری بات کسی طرح اللہ تک پہنچ جائے۔ وہ تو ہماری بلند آواز کا محتاج نہیں۔ وہ تو ہمارے دلوں کے حال بلکہ اس سے پوشیدہ تر چیزوں کو بھی جانتا ہے۔

پھر ذرا اس شخص کے حال پر غور کیجئے جو اس وقت نماز میں مشغول ہے۔ وہ کس کے سامنے کھڑا ہے؟ اللہ کے سامنے۔ وہ کیا کر رہا ہے؟ وہ قرآن پڑھ رہا ہے، اللہ سے مناجات کر رہا ہے، اپنے دل کو دنیاوی تمام مشغولیات سے ہٹا کر اپنے رب کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

تو کیا اسلام ہمیں یہ اجازت دیتا ہے کہ ہم اپنی عبادت کے نام پر یا محض محبت کی آڑ میں دوسرے مسلمانوں کی عبادت میں خلل ڈالیں؟ ایک بندہ غلام کو یہ حق آخر کس نے دیا کہ وہ دوسرے بندہ غلام کو – جو اپنے مالک کے سامنے سر بسجود ہے – اس کی عبادت کے دوران تکلیف پہنچائے؟

ممکن ہے اس نمازی کی نماز فقہی اعتبار سے ادا ہو جائے، لیکن جس شخص نے اپنے عمل سے اس کی نماز، تلاوت یا خشوع میں خلل ڈالا، اس نے یقیناً ایسا عمل کیا جو اسلامی ادب اور باہمی حقوق کے منافی ہے۔

چوتھی اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ بلند آواز سے ذکر کرنے کی آخر حاجت ہی کیا ہے؟ کیا نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ بھی دنیا کے بادشاہوں اور حکمرانوں کی طرح ہے کہ اس کے دربار میں اپنی غلامی ثابت کرنے کے لئے بلند آواز سے نعرے لگائے جائیں؟ یا نعوذ باللہ وہ ہماری طرح کمزور سماعت رکھتا ہے کہ زبان سے نکلی ہوئی بات اس تک اس وقت تک نہیں پہنچ سکتی جب تک گلا پھاڑ کر نہ کی جائے؟

ہرگز نہیں!

اللہ تعالیٰ ان تمام کمزوریوں سے پاک ہے۔ وہ دلوں کے بھیدوں سے بھی واقف ہے، بلکہ دلوں میں چھپی ہوئی بات سے بھی با خبر ہے۔ اس لئے قرآن ہمیں متنبہ کرتا ہے:

> "پس اللہ کے لئے مثالیں نہ گھڑو، بے شک اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔"
>
> (النحل: 74)

اور سورۃ طٰہٰ میں فرمایا:

> "اور اگر تم بلند آواز سے بات کرو تو وہ تو پوشیدہ بات بلکہ اس سے بھی زیادہ پوشیدہ چیز کو جانتا ہے۔"

(طٰہٰ: 7)

ابو داؤد میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں اعتکاف فرما رہے تھے۔ آپ ﷺ نے لوگوں کو بلند آواز سے قرآن پڑھتے ہوئے سنا تو آپ ﷺ نے پردہ اٹھایا اور فرمایا:

"خبردار! تم میں سے ہر شخص اپنے رب سے مناجات کر رہا ہے، لہٰذا تم میں سے کوئی دوسرے کو تکلیف نہ دے اور نہ ہی کوئی دوسرے کے مقابلے میں قرآن میں اپنی آواز بلند کرے۔" یا آپ ﷺ نے فرمایا: "نماز میں۔"

دوسری روایت میں نبی ﷺ نے فرمایا: "اے لوگو! اپنے اوپر نرمی کرو، تم کسی بہرے یا غائب کو نہیں پکار رہے۔"

(ابی داؤد 1528)

اگر قرآن بلند آواز سے پڑھنے پر نبی ﷺ نے صحابہؓ کو روک دیا کہ وہ دوسروں کے لئے تکلیف کا باعث ہے، تو آخر ان لوگوں کی جرأت پر سلام ہے کہ جو مسجد میں بلند آواز سے اذکار کرتے ہیں یا محبت کی آڑ لے کر فجر کے بعد سلام پیش کرتے ہیں جبکہ لوگ نماز اور اذکار میں مصروف ہوتے ہیں۔ آخر ان کی عقل کو دیمک لگ چکی ہے، یا پھر وہ کتب ناپید ہو چکی ہیں جس میں اس طرح کے جہر کا حکم آیا ہے؟ ہمارے علم میں تو وہ ماخذ نہیں، اگر آپ کے پاس ہیں تو براہِ کرم پیش کیجیے۔

اختتامیہ

لہٰذا میری التماس ہے کہ خود کو کسی بھی فرقہ سے منسلک کرنے کی بجائے خود کو مسلمان، اہلِ سنت و الجماعت سے وابستہ رکھیں۔ حق کا معیار خدا کی کتاب اور نبی ﷺ کی سنت ہو، وہ جہاں بھی ملے وہیں سے لے لی جائے۔ اپنے مذموم عقائد پر مار گنج بن کر نہ بیٹھ جائیں، بلکہ جو عقل و شعور خدا نے انسان کو دیا اس کو استعمال کرتے ہوئے حق بات تک پہنچا جائے۔ جب یہ معیار آپ اپنا لیں گے تو پھر آپ کو کسی فرقہ اور گروہ سے تعصب اور نفرت نہیں رہے گی، بلکہ جہاں اور جو بھی حق بات کہے گا وہ بات سر آنکھوں پر ہو گی اور خلافِ حق بات رد کر دی جائے گی خواہ اپنے آباؤ اجداد سے ہی نسبت کیوں نہ ہو۔

جو شخص اپنی خواہش کو عقل کے تابع رکھتا ہو اور عقل سے کام لے کر فیصلہ کرتا ہو کہ اس کے لئے صحیح راہ کونسی ہے اور غلط کونسی، وہ اگر کسی بھی غلطی پر ہو تو اسکو سمجھا کر سیدھی راہ پر لایا جا سکتا ہے اور امید کی جا سکتی ہے کہ جب وہ راہِ راست اختیار

کرے گا تو اس پر ثابت قدم رہے گا۔ لیکن نفس کا بندہ اور خواہشات کا غلام ایک شترِ بے مہار ہے، اس کو تو خواہشات جدھر جدھر لے جائیں گی وہ ان کے ساتھ بھٹکتا پھرے گا۔ اس کو سرے سے یہ فکر ہی نہیں کہ صحیح و غلط اور حق و باطل میں تمیز کرے اور ایک کو چھوڑ کر دوسرے کو اختیار کرے، پھر اسے کون سمجھا کر راستی کا قائل کر سکتا ہے؟

یہ بات تجربہ سے ثابت ہے کہ جو شخص بغض و عناد اور تعصب میں مبتلا ہو اس کے لئے صحیح و غلط میں کوئی فرق نہیں، وہ اپنے عقائد کا غلام ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اسے چمکتے سورج کی طرح دلائل بھی دے دیے جائیں تو وہ اس کی بھی یہی توجیہ کرے گا کہ یہ ایک بھڑ ہے جس کی کوئی اصل نہیں۔ لہذا ہمارا کام صرف بات کو پہنچا دینا ہے، باقی ہدایت اللہ کے اختیار میں ہے۔

> "اور ہمارے ذمہ تو صرف صاف صاف پہنچا دینا ہے۔"
>
> (یٰسین: 17)

خاکسار

محمد عاطف